مہدی افادی

(حالاتِ زندگی)

اُردو کے مشہور ادیب اور نقاد مہدی حسن الافادی ۱۸۷۵ء میں گورکھپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی علی حسن کورٹ انسپکٹر تھے۔ مہدی کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی اور انہوں نے عربی، فارسی اور اُردو میں خاص دسترس حاصل کی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد سکول میں داخل ہو کر انگریزی پڑھی۔ گورکھپور سے میٹرک پاس کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ایف۔اے اور بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۶ء میں تحصیل دار کی حیثیت سے ملازمت کا سلسلہ شروع کیا۔

مہدی افادی اُردو ادب کے شگفتہ و صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ علم الاعضا کے پروفیسر کی طرح اُردو میں نسوانی حسن کے جائزے اور توضیح کے معاملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اُردو میں طرزِ بیان مولانا محمد حسین آزاد اور میر ناصر علی دہلوی کے ادب کا مجموعی عکاس ہے۔

وہ فطرتاً زندہ دل اور شگفتہ مزاج اور خوش مزاج آدمی تھے۔ ادب کا انہیں خاص ذوق تھا۔ اپنے عہد کے مشاہیرِ ادب مثلاً سر سید، شبلی اور نذیر احمد سے گہرے مراسم تھے۔ ان کی تحریروں میں ان بزرگ شخصیات کی دلچسپ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مہدی افادی کو نئے نئے الفاظ بنانے اور تراکیب کی تراش کا خاص ملکہ تھا اور عبارت کو بنانے سنوارنے میں خاص محنت کرتے تھے۔ اُن کی تنقید بھی انشا پردازی کے وصف سے خالی نہیں۔ وہ انگریزی ادب سے بہت متاثر تھے۔ انگریزی کی کئی تراکیب کو اُردو میں اس خوبی سے منتقل کیا کہ وہ اس میں رچ بس گئیں۔

اُن کی نثر، متین، سنجیدہ، سلیس، بے تکلف، رواں دواں اور دل نشیں ہے۔ تحریر میں روزمرہ، محاورہ بندی، بے تکلفی اور برجستگی جیسی وضاحت موجود ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا جا بہ جا استعمال کرتے ہیں۔ ماہ نامہ ''نقاد'' آگرہ کے ابتدائی پرچوں میں شائع شدہ ان کے ادبی مضامین کے باعث انہیں غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔

مہدی افادی نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ ادبی زندگی کا کل سرمایہ وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً برصغیر کے ادبی رسائل میں چھپے اور بعد ازاں ''افاداتِ مہدی'' کے نام سے مجموعے کی صورت میں شائع ہوئے۔ خطوط کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ ان کے مکاتیب بھی ادب و انشا کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

اُردو لٹریچر کے عناصرِ خمسہ

(مہدی افادی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو اُردو ادب کے مختلف عناصر سے آگاہی دلانا۔
۲۔ طلبہ کو مہدی افادی کے طرزِ تحریر سے آگاہ کرنا۔
۳۔ اُردو نثری ادب میں مہدی افادی کا مقام بتانا۔
۴۔ اُردو نثر کے تدریجی ارتقا سے واقفیت دلانا۔
۵۔ عبارت میں معاون فعل تلاش کرنا۔

خاص الفاظ و تراکیب: نشاۃ الثانیہ ۔ سِکہ جمانا ۔ اقلیمِ سخن ۔ آنکھیں ملانا ۔ ادب القدما ۔ واجب التعظیم
تغیر پذیر ۔ تنقیداتِ عالیہ ۔ پیوندکاریاں ۔ لائقِ پرستش ۔ مجتہدانہ ۔ بازگشت

آئندہ زمانے میں اُردو لٹریچر کی اگر تاریخ لکھی گئی تو اُنیسویں صدی کا پچھلا دور اس کا ''نشاۃ الثانیہ'' (یعنی دورِ جدید) ہوگا۔ جس میں ایک بازاری زبان جس کا سرمایۂ ناز بے غایت شاعری کا مجموعۂ خود رو تھا۔ منازلِ ارتقائی طے کرتی ہوئی اُس سطحِ امتیاز کے قریب پہنچ گئی جہاں دنیا کی اعلیٰ تر زبانیں اپنا سِکہ جما رہی ہیں۔

کل کی بات ہے جب تک سے تک ملا لینا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا، گرمیِ محفل کے لیے چند مصرعوں کی پیوندکاریاں لٹریچر کے فرائض سے ہم کو سبک دوش کر دیتی تھیں، لیکن تقاضائے وقت کے ساتھ تغیرِ مذاق دیکھیے کہ آج ہم کو اُن کے ذکر سے بھی شرم آتی ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم دیکھتے ہی کائنات میں کوئی چیز نہیں جو تغیر پذیر نہ ہو، ہمارے جذبات بدلے، خیالات بدلے، تغیرِ حالت کے ساتھ وہ آثارِ خارجی بھی جن میں ہم گھرے ہوئے تھے، کچھ سے کچھ ہو گئے۔ غرض زمین بدلی، آسمان بدلا اور وہ بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے اور ابھی معلوم نہیں مؤثرات خارجی اور واقعات کی قدرتی رَو ہم کو کہاں سے کہاں لے جائے گی۔

اس کشمکش اور سلسلۂ انقلابات میں اتنا ہوش کہاں کہ طبقاتِ ارتقائی کی درمیانی کڑیاں آپ کو گنائی جائیں، صرف یہ سمجھ لیجیے کہ بوسیدہ اور فانی اجزا کی جگہ قوی تر عناصر نے لی اور اقلیمِ سخن کی شریف تر ہستیاں عالمِ وجود میں آئیں، جن سے اردو، فلسفۂ ادب سے آشنا ہوگئی۔

میری غرض لائقِ عزت سرسید، پروفیسر آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی سے ہے، جن کے قلم کے سائے میں اُردو یعنی کل کی چھوکری اتنی روادار ہوگئی کہ السنۂ یورپ یعنی مغربی بہنوں سے بے تکلف آنکھیں ملا سکتی ہے۔ ان میں سے ہر شخص مختلف النوع خصائصِ ادبی کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کار کا آپ مالک ہے اور جس طرح ادب اُلقدما (یعنی کلاسیکس) آج واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے، ایک وقت آئے گا، جب ان کے ادبیات کا بیش تر حصہ لائقِ پرستش اور غیر فانی سمجھا جائے گا۔

یہ موضوع نہایت اہم ہے اور چوں کہ بہت پھیلایا جا سکتا ہے، اس لیے سرسری طور پر ٹالنا منظور نہیں، بلکہ میری خواہش ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے اس پر قلم آزمائی کریں، میری غرض لائف نگاری سے نہیں ہے بلکہ صرف تنقیدِ ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں، جس میں بہ لحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیداتِ عالیہ (یعنی ہائر کریٹی سزم) کا حق ادا ہو جائے۔

سرسید نے ادب اور معقولات پر جس حد تک مجتہدانہ رنگ چڑھایا دراصل اُن کے اولیات میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ یہ اُن ہی کے قلم کی آوازِ بازگشت ہے جو ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کے لیے دلیلِ راہ بنی، آج جو خیالات بڑی آب و تاب اور عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ مختلف لباس میں جلوہ گر ہیں، دراصل اُسی زبردست اور مستقل شخصیت کے عوارض ہیں، ورنہ پہلے یہ جنسِ گراں اچھے اچھوں کی دسترس سے باہر تھی۔ سرسیّد کے کمالاتِ ادبی کا عدم اعتراف صرف ناشکری نہیں بلکہ تاریخی غلطی ہے اور میں خوش ہوں کہ شریف النفس حالؔی نے آج کل کی بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھ کر منحرف طبائع کو سخت سے سخت شکست دی جو خیال میں آسکتی ہے، لیکن نئی نسل پچھلا سبق کسی قدر بھول چلی ہے، حالاں کہ سرسید کے حقوق زیادہ تر اسی کی گردن پر ہیں، بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ خود لٹریچر کے حقوق کا اقتضا یہ ہے کہ سرسید کے علمی کارنامے پر نگاہ عکس ریز ڈالی جائے اور اُس کے لیے سید سجاد حیدر (یلدرم) مجھے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ نذیر احمد کو میں ''ثم المارہروی'' توبہ! سید افتخار عالم کے سر لگانا چاہتا ہوں جنھوں نے حال میں مولانا کی نہایت مفصل سوانح عمری شایع کی ہے، بااِستحقاق ان سے بہتر کوئی شخص خیال میں نہیں آتا، یہ لکھیں گے اور ہمیں درانہ اور سخن گسترانہ لکھیں گے؛ اسی کی ضرورت ہے۔ نذیر احمد گو ایک حد تک ''عقلیات'' سے رسیّاں تڑاتے رہے، لیکن ادب اور منقولات سے متعلق جو دفتر انہوں نے چھوڑا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ کچھ سرسری ریمارکس دینا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں۔ ان کی اعلیٰ درجے کی عربیت کے ساتھ بے مثال قدرتِ بیان، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدتِ خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اُس شخص کا حصہ ہیں، لٹریچر کی جان ہیں، اس پر اضافہ کیجیے۔ اُردو سی کم مایہ زبان کا ایسے شریفانہ قالب میں ڈھلنا جس پر کلاسیکس کا دھوکا ہو۔

بعض صاحبوں کو غالبؔ کی طرح ان کی مشکل پسندی کا رونا ہے، اور وہ پیوند کاریاں جو اُن کی شُستہ رفتہ اور برجستہ اردو میں ہوتی ہیں جس میں انگریزی زیادہ بے جوڑ ہوتی ہے، عام خیال ہے کہ ثقل سے خالی نہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ سب اُن کی جدت اختراع اور قوتِ آخذہ کا زور ہے۔ آمد کی رَو میں اضطراری طور پر اپنے پرائے کی تفریق نہیں ہو سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ بعض حصے بہ لحاظ ترکیب و تحلیل اجزائے السنہ غیر گنگا جمنی ہوتے ہیں۔ تاہم، متانت اور حُسنِ کلام سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے جو ان کے لٹریچر کا خاصۂ طبعی ہے، نہ ان کے اچھوتے اور مستقل طرزِ ادا (اسٹائل) پر جو شارعِ عام سے الگ تھلگ اور آپ اپنی نظیر ہے،

کوئی اثر پڑتا ہے، جو باتیں اوروں کے ہاں بے گانی ہیں کہ مغائرت یا اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر بھی جہاں تک اِس حیثیت سے اعتراض کی گنجائش ہے، ادب چاہتا ہے، سبک نکتہ چینیوں سے اُن کا کمال ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ باوصف کمالاتِ علمی جو ایک حد تک ان کے ہم عصروں کو بھی مرعوب کرنے والے تھے، ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ مذاقِ سخن کی آزمائش کا بہتر سے بہتر پیرایہ کیا ہو سکتا تھا۔

جس طرح ناولوں اور تراجم میں بہ رعایتِ فن یہ اپنی قادر الکلامی کا بڑے سے بڑا ثبوت دے سکے، لٹریچر کے وہ اجزا جن کا موضوع زیادہ اہم اور سنجیدہ ہے، مثلاً فلسفۂ تاریخ وغیرہ، جس میں وسعتِ نظر کے ساتھ تحقیق و تنقید، قوت استقرا، تضریح مسائل اور فلسفیانہ استخراج نتائج کے ساتھ، غیر منقطع انضباطِ خیال کی ضرورت ہے۔ یہ قصداً اس طرف نہیں آتے، یہی حدّ فاضل ہے جو شبلی کے قلم رو سے ان کے دائرہ کمالات کو جُدا کرتی ہے اور یہی وہ آزادی ہے جس کے آثار ان کے لیکچروں میں آپ دیکھیں گے اور جس کی بنا پر یہ اکثر کہا گیا ہے کہ وہ موضوعِ سخن کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا مرتبہ، انشا پردازی چاہتا ہے کہ ہم مان لیں کہ یہ صرف زورِ بیان کا قصور ہے جو اظہارِ فصاحت میں کسی چیز کا محکوم نہیں ہوتا۔

زمانہ کتنی ہی ترقی کرے، اس علم کے پتلے کو پھر پیدا نہیں کر سکتا، جس کا کوئی رونگٹا بے کار نہیں۔ جہاں تک لائقِ ادب ''مشرقیت'' کا تعلق ہے۔ قوم کی یہ آخری بہار تھی جس کے اجزا کچھ اُٹھ گئے کچھ باقی ہیں۔ قدیم علوم کے نام لیوا ایک آدھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ جس عربی، مرحوم عربی کو ہم بیسویں صدی میں ڈھونڈتے ہیں، علامہ نذیر احمد کے ساتھ دفن ہو گئی، مگر ان کا حصہ، غیر فانی یعنی ان کی تصنیفات مرنے والی چیز نہیں، وہ اپنی بقائے دائمی کی آپ ضامن ہیں، اور یہی انسان کا بڑے سے بڑا تخیل (آئیڈیل) ہے، جس سے دنیا میں کوئی بے نیاز نہیں۔

نذیر احمد کے استادانہ اور باوقار لٹریچر کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی اب ہو نہیں سکتی، لیکن اخلاف کے لیے جس قدر سرمایۂ علمی انہوں نے چھوڑا ہے وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ہمیشہ اُن کی یاد دلاتا رہے گا۔ ہم اُن کی قیمتی تصنیفات کو سینے سے لگائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے، دائمی جُدائی کے بعد، ادائے سپاس کا حق کچھ تو ادا ہو رہے۔

سرسید کے بعد اگر اُن کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو بوڑھے حالی ہیں، یہ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں، اعلیٰ درجے کے ناثر بھی ہیں۔ لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے، جس نزاکت کے ساتھ ادائے خیال کے مختلف پہلوؤں سے دیکھتے دیکھتے یہ اپنا مطلب نکال لیتے، کثرت مواد کے ساتھ بھی دوسرے اس قسم کے لطیف تصرفات نہیں کر سکتے۔ طبیعت میں ایک جچا تُلا خاص طرح کا مادہ ہے جو حشو و زوائد سے غرض نہیں رکھتا اور ساتھ ہی کسی موضوعِ بحث میں اُن نکاتِ متعلقہ کی طرف نہایت خوبصورتی سے فوری انتقالِ ذہن کا باعث ہوتا ہے جو دراصل اُس بحث کی

جان ہوتے ہیں، لٹریچر کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیے جائیں، یہ سلاست و نفاست قدرتِ کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصے میں آئی۔

یادش بخیر! شبلی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، جس سے زیادہ ایک زندہ مصنف پر قلم آزمائی کی گنجائش نہیں۔ چبائے ہوئے نوالوں کا بار بار منھ میں پھیرنا، خواہ وہ کتنے ہی خوش ذائقہ ہوں، جدت طرازی جائز نہیں رکھتی اور چوں کہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکوں گا۔ اس لیے مختصراً اس قدر کافی ہے کہ شبلی ملک میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے تاریخ پر فلسفے کا رنگ چڑھایا اور حکیمانہ انکشافات و نکتہ آرائیوں سے اُسے ایک مستقل فن بنا دیا۔ ''شعر العجم'' کے چوتھے حصے میں فلسفہ و شاعری پر مختلف پہلوؤں سے جس جس طرح تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس پر دنیا کی کوئی بھی زبان فخر کر سکتی ہے۔ ''ادب لاساتذہ'' کا بہتر سے بہتر مرقع ہے۔

لیکن سا جامعیت کے ساتھ بھی سوال یہ ہے کہ قوم نے کہاں تک حوصلہ افزائی کی؟

کل کی بات ہے ایک اتفاقی واقعے پر شبلی پر ملک کے چپے چپے سے لے دے شروع ہوگئی، اور اس قدر شور و غل ہوا کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔ بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامہ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہے، کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟ ہرگز نہیں! صرف حاسدین کی کم نظری تھی، دلوں کی جمی ہوئی سیاہی لغزشِ قلم سے ٹپکی اور بُری طرح ٹپکی۔

لیکن شرافتِ علم دیکھیے! شرر کو، جو ''شبلی'' پر کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں کرتے تھے، اس ناگوار واقعے کے بعد جس کا انجام ندوہ سے مولانا کی دست کشی پر ہوا، اپنی آواز بلند کرنی پڑی، وہ صاف صاف کہہ گزرے کہ ندوہ میں جو کچھ دم تھا، شبلی کی وجہ سے تھا۔ اب وہ ایک جسدِ بے رُوح ہے۔ اسی ضمن میں مولانا کے کمالات کا شناسانہ اعتراف اور قوم کی ناسپاسی کا رونا تھا۔

بہرحال، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ شبلی پر اگر کوئی قلم اُٹھانا چاہے تو جی لگنے کے سامانوں میں کمی نہیں، میرے خیال میں سید عبدالماجد اگر فلسفۂ تاریخ سے اتنی ہی دلچسپی کا اظہار کرتے، جس اہتمام سے الکلام پر منحرفانہ نظر ڈالی گئی تھی، تو کفارۂ معصیت کے ساتھ تنقید کا بھی حق ادا ہو جاتا۔

سب سے آخر، مگر دراصل سرِ فہرست، آزاد پر خود کچھ لکھنا چاہتا ہوں، آزاد اس پائے کے ادیب ہیں کہ ان کے دائرے کے اور خلاقینِ سخن کو اُن کے آگے سر جھکانا پڑے گا۔ آزاد کی جن حیثیتوں پر خوبصورتی کے ساتھ نگاہ پڑ سکتی ہے وہ تحقیقات السنہ کے مذاق کے ساتھ پاکیزگیِ زبان اور آزاد کا خاص اندازِ بیان ہے جس سے اُن کی نثر عموماً زرنگار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مغربی شاعر کے خیال میں، جس نے شوخی سے عالمِ فطرت (نیچر) کمالِ صنعت (آرٹ) کو ترجیح دی ہے، خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرشِ ریشمی پر بکھر جانا روانیِ آب سے زیادہ دل کش ہے، مگر اس سے زیادہ تر دل کش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مُرصع پیداوارِ دماغی جو حسنِ صوری اور معنوی کے ساتھ آمد اور بے ساختہ پن کی تصویر ہو۔ اُس کے سلیس و نفیس لٹریچر کا یہ وصفِ اضافی کہ روکھے پھیکے مسائل کو بھی اِس لطافت سے جذب کر سکے کہ کہیں سے بارِ طبیعت نہ ہو اور

فسانے (یعنی لائٹ ریڈنگ) کا لطف آئے میرا خیال ہے، لائق ذکر خصائص میں سے ہے۔ جس کی بنا پر ایک مشہور موقع پر یہ کہا گیا تھا کہ ''آزاد اُردوئے مُعلٰی کا ہیرو ہے''۔ جس طرح تاریخ میں فلسفے کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چڑھایا ہے، اُردو کو انشا پردازی کے درجے پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلہ پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے، لیکن آزاد کی ادبی فتوحات، تاریخِ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے، جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔

سرسید سے ''معقولات'' الگ کر لی جیسے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی، جہاں تک نثر کا تعلق ہے، سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن ''آقائے اُردو'' یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں، جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں، اسی لیے واقعات بھی انہوں نے جس قدر لکھے ''قصص'' (یعنی ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں ''افسانۂ یارانِ کہن'' کہیے۔

بہرحال، ارکان خمسہ کی تجویز آپ کے سامنے ہے، اکبری نورتن کے مقابلے میں بعض صاحبوں کو یہ تجدید پسند نہ آئے گی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ ''مصنفین کی صفِ اوّل'' میں اس سے زیادہ گنجائش معلوم نہیں ہوتی، تاہم غیر ضروری نکتہ چینی سے علیحدہ ہو کر اگر کوئی صاحب (بہ شرط یہ کہ لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں) مجھے مفید مشورہ دے سکے تو میرا خیال ہے میں اُس پر غور کرنے کے لیے ایک حد تک تیار ہوں۔

(آفادات مہدی)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مہدی افادی کا ''عناصرِ خمسہ'' سے کیا مراد ہے؟

ب) مہدی افادی کلاسکس کی اہمیت پر کیوں زور دیتے ہیں؟

ج) مصنف کے خیال میں سرسید نے ادب اور معقولات پر کون سا رنگ چڑھایا اور کیسا؟

د) مہدی افادی علامہ نذیر احمد کی تخلیقات پر رائے دیتے ہوئے کیوں پریشان دکھائی دیتے ہیں؟

ہ) مہدی افادی سرسید کے بعد مولانا حالی کو کس طرح اُن کا جانشین قرار دیتے ہیں؟

و) مصنف اُنیسویں صدی کے پچھلے دور کو نشاۃ الثانیہ سے کیوں تعبیر کرتے ہیں؟

ز) مہدی افادی بیسویں صدی میں علامہ عربی کس ادیب کی موت کے ساتھ دفن سمجھتے ہیں اور کیوں؟

۲۔ سبق ''اُردو لٹریچر کا عناصرِ خمسہ'' کے متن کی روشنی میں درست جواب کا انتخاب کیجیے۔

الف) مہدی افادی نے اعلیٰ درجے کی مربّیت کا ذکر کیا ہے:

i) سرسید احمد خان کی ii) مولانا نذیر احمد کی

iii) مولانا الطاف حسین حالی iv) علامہ شبلی نعمانی کی

ب) مہدی افادی فطری تاثر سمجھتے ہیں:

i) مولانا الطاف حسین حالی کو
ii) علامہ شبلی نعمانی کو
iii) مولانا نذیر احمد کو
iv) مرزا غالب کو

ج) ''شعرالعجم'' کا مصنف ہے:

i) مولانا نذیر احمد
ii) سرسید احمد خان
iii) مولانا الطاف حسین حالی
iv) علامہ شبلی نعمانی

د) مہدی افادی سرسید احمد خان کے علمی کارناموں کو اُجاگر کرنے کے لیے اہم سمجھتے ہیں:

i) سجاد یلدرم
ii) سید سلیمان ندوی
iii) ڈاکٹر وزیر آغا
iv) احمد ندیم قاسمی

ہ) بقول مہدی افادی بعض ادیب مولانا محمد حسین آزاد کی سے نالاں تھے:

i) ہندی
ii) مشکل ہندی
iii) تنقیدی رویے
iv) جدید طرز تحریر

۳۔ سبق ''اُردو لٹریچر کا عناصر خمسہ'' کے متن کی روشنی میں درست جُملے کی نشاندہی (✓) اور غلط کی (✗) سے کریں۔

الف) مولانا محمد حسین آزاد کو ''اُردو دور کا ہیرو'' کہا گیا ہے۔
ب) مولانا الطاف حسین حالی کو سوانح عمری ''علامہ شبلی نعمانی'' نے شایع کی ہے۔
ج) سرسید احمد خان لائف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ رکھتے تھے۔
د) مہدی افادی سرسید احمد خان کے معقولات کو اہم نہیں سمجھتے تھے۔
ہ) آزاد کا خاص اندازِ بیان ''پاکیزگیِ زبان'' ہے۔

۴۔ سبق ''اُردو لٹریچر کا عناصر خمسہ'' کے متن کے مطابق خالی جگہ درست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) ارکان خمسہ کی تجویز.................. کے مقابلے میں بعض ادباء کو پسند نہیں آئے گی۔
ب) مہدی افادی مصنف.................. کے لیے انشا پردازی ہی کافی سمجھتے ہیں۔
ج) شعرالعجم میں..................کا بہتر سے بہتر مرقع پایا جاتا ہے۔
د) مہدی افادی کے مطابق مولوی عبدالحق.................. کے کلام پر دادِ سخن دیکھیں گے۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''ایک مغربی شاعر کے خیال میں..................آزاد اُردو دور کا ہیرو ہے۔

۶۔ اس سبق میں مہدی افادی کے اسلوبِ تحریر پر ایک مضمون تحریر کریں۔

۷۔ اس سبق میں بیان کیے گئے ادباء کے اسلوبِ تحریر کا آپس میں موازنہ کریں۔
۸۔ اس سبق کا مرکزی خیال مختصراً تحریر کریں۔
۹۔ اس سبق کا خلاصہ تحریر کریں۔

فعل

تعریف: فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا، ہونا، یا نہ کرنا، نہ ہونا زمانے کی قید کے ساتھ پایا جائے۔ یعنی ماضی، حال اور مستقبل۔ ان تینوں زمانوں میں سے ایک ضرور پایا جائے گا۔ مصدر اور فعل میں فرق یہی ہے۔ کہ مصدر میں کسی کام کے کرنے یا ہونے کا عمل تو پایا جاتا ہے لیکن اِس میں زمانہ نہیں ہوتا۔ مثلاً اسلم دوڑتا ہے۔ اس جملے میں دوڑنا فعل ہے۔

امدادی افعال سے فعل بنانا: کام کو فعل کہتے ہیں بعض اوقات ایک جملے میں ایک سے زیادہ افعال استعمال ہوتے ہیں۔ جن میں ایک بنیادی فعل ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرا بنیادی فعل کی امداد کرتا ہے۔ وہ دوسرا فعل جو بنیادی فعل کی مدد کرتا ہے۔ امدادی فعل کہلاتا ہے۔ مثلاً اسلم ہنس پڑا۔

امدادی فعل کا مقصد بات زیادہ واضح کرنے اور بات پر زور دینے کے ساتھ ساتھ کلام میں حسن و خوبی، فصاحت و بلاغت اور لطافت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ امدادی فعل کی مدد سے کلام یا بات میں بے شمار لطیف معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ امدادی فعل سے اصل فعل کی کیفیت و حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اور زمانے (ماضی، حال اور مستقبل) کی صحیح حالت کا تعین کرتا ہے۔ فقروں کی تکمیل اور تشریح کرتا ہے۔ امدادی فعل دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱) ایسے افعال جو اصل افعال کے معانی کی تکمیل کرتے ہیں۔ ۲) ایسے افعال جو اپنے کچھ نہ کچھ معانی بھی ضرور دیتے ہیں۔

معاون افعال: اُردو میں بالعموم استعمال ہونے والے امدادی افعال مندرجہ ذیل ہیں۔

آنا۔ اٹھنا۔ پڑنا۔ جانا۔ چاہنا۔ چلنا۔ دینا۔ رہنا۔ رکھنا۔ سکنا۔ کرنا۔ لینا وغیرہ

مثلاً میں کوئٹہ سے ہو آیا ہوں۔ وہ میرا سارا روپیہ دبا بیٹھا۔ خبردار! کوئی اندر نہ آنے پائے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے مذکورہ پانچ شعرا و ادبا کی زندگی سے متعلق مضامین لکھوائیں۔
۲۔ کمرۂ جماعت میں طلبہ کے درمیان اسلوبِ تحریر پر مباحثہ کروائیں۔
۳۔ کسی بھی علمی تحریر پر تنقیدی گفتگو کروائیں۔
۴۔ طلبہ سے سبق میں موجود چند امدادی افعال تلاش کروائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو مہدی افادی کے اسلوبِ نثر سے آگاہ کریں۔
۲۔ اُردو نثر کا تدریجی ارتقا بتائیں۔
۳۔ اُردو نثر میں مہدی افادی کے مقام سے آگاہ کریں۔